درجے کا منتظم اور بہترین مدبّر تھا۔فوجی مہمات سے لیکر۔۔۔فکری معرکہ آرائیوں تک۔۔۔وہ بادشاہ کے ساتھ رہتا۔الپ ارسلان کے بعد ملک شاہ کے تاج وتخت کے لیے بھی نظام الملک نے راستے ہموار کیئے۔اس کی دانشمندی سے کئی بغاوتیں کچلی گئی اور مشکلات رفع ہوئی۔ملک شاہ نے اپنے مخلص اور دیانتدار وزیر کو باپ کا درجہ دیتے ہوئے "اتا بک" یعنی شاہ باپ، کا خطاب عطا کیا۔(۲)

تاہم یہ بھی ایک تلخ حقیقت ہے کہ اسی ملک شاہ کے ساتھ نظام الملک کا کسی معاملہ پر اختلاف ہوگیا تو ملک شاہ نے نظام الملک کو یہ دھمکی دی کہ وہ اس کے میز سے "دوات" اٹھوا دے گا، جو اُس کے عزل کی علامت ہوگی۔تو اس پر نظام الملک نے کہا کہ اگر میری میز پر "دوات" نہ رہی تو بادشاہ کے سر پر تاج بھی نہیں رہے گا۔اس درشت جواب پر سلطان غضبناک ہوگیا جس کے سبب نظام الملک جیسے ذہین اور عظیم آدمی سے دنیا محروم ہوگئی، تاہم اس کے بعد بادشاہ بھی زیادہ دیر زندہ نہ رہ سکا۔ملک میں بدنظمی پھیل گئی اور صلیبی جنگیں مسلمانوں کے لیے عبرت کا پیغام لیکر آئیں۔

دینی تدریس اور مذہبی تعلیم سے متعلق مستند حلقے تقریباً اس امر پر متفق ہیں کہ اسلامی مدارس کا صحیح بانی نظام الملک طوسی ہی ہے۔نظام الملک نے مسلمانوں کے تدریسی نظام کے فروغ کو ایک تحریک کی شکل دی۔مدارس کی پُرشکوہ عمارات اور دارالاقامے قائم کیئے۔اسلامی دنیا کے طول وعرض میں مدارس کا مضبوط نٹ ورک قائم کیا جس کے سبب اس شعبہ میں نظام الملک ہمیشہ کے لیے ناقابل فراموش ہوگیا۔گویا دینی تدریس یا مدارس کے لیے "نظامیہ" کا لفظ یا تصور کم وبیش ایک ہزار سال پرانا ہے۔جس کے ساتھ مدرسہ کا بنیادی تصور اور اس کے نمایاں خدوخال وابستہ ہیں۔

ہر چند کہ اس سے پہلے بھی کچھ مدرسے موجود تھے، مثلاً نیشا پور کا مدرسہ، جہاں امام غزالیؒ نے تعلیم پائی۔لیکن "نظامیہ" کے قیام کے بعد سے تو مدارس کی تشکیل کا سلسلہ جنگل کی آگ کی طرح عالم اسلام میں پھیلتا چلا گیا۔شام، عراق، مصر، عرب، وسط ایشیا اور ہندوستان میں ہزارہا مدرسے قائم ہوگئے۔تفسیر، حدیث اور فقہ کے الگ الگ مدارس کی تشکیل عمل میں آئی، جس میں حنفی، شافعی، مالکی اور حنبلی فقہ کے علیحدہ علیحدہ مدارس کے ساتھ اثناعشری مدارس کی روایت بھی موجود تھی۔

برصغیر میں مدارس کا نظام

برصغیر میں مدارس کا نظام غزنی سے آئے ہوئے ترکوں کی وساطت سے پہنچا۔ملتان، لاہور اور دہلی میں مدرسے قائم کیئے گئے اور عالم اسلام میں دوسری جگہوں پر جو نصاب چل رہا تھا وہ یہاں بھی رائج ہوا۔کئی

صدیوں تک اس میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ الا یہ کہ کوئی مسلمان بادشاہ اپنی حکومتی ضروریات کے پیش نظر نصاب تعلیم کو اپنے دور کی ضرورت سے ہم آہنگ کر لیتا۔ اس خطے پر غزنی تسلط کے دور میں دنیائے اسلام میں تمام اسلامی علوم بخوبی نشو ونما پا چکے تھے۔ لہٰذا اس بات کا قوی امکان ہے کہ وہ سارے علوم جو کہ خراسان اور ماوراء النہر میں پڑھائے جاتے تھے ان علاقوں میں بھی پڑھائے جاتے۔ جیسا کہ اس سلسلے میں خلیق احمد نظامی نے لکھا ہے کہ:

> یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ جس وقت پنجاب میں غزنویوں کا تسلط قائم ہوا تھا اس وقت تمام اسلامی علوم مثلاً تفسیر، حدیث، فقہ اور تصوف اچھی طرح نشو ونما پا چکے تھے۔ غزنی شہر جو محمود کے زمانے میں اسلامی عجم کا سب سے بڑا مرکز تھا، اس سب علوم کا گہوارہ بن گیا تھا۔ جب پنجاب سلطنت غزنی کا ایک ٹکڑا ہو گیا تو دار الحکومت کے ماحول سے متاثر ہونا ممکن نہ تھا۔ حدیث اور فقہ کی بیشتر کتابیں غزنی اور اس کے ارد گرد کے علاقے میں تصنیف ہوئی تھیں۔ ان حالات میں سلطنت غزنین کا ایک اہم حصہ پنجاب کس طرح ان علوم سے نابلد اور نا آشنا رہ سکتا تھا۔ (۳)

سلطان محمود کے الحاق پنجاب کے بعد پتہ چلتا ہے کہ اس عہد میں پنجاب کے شہر لاہور، ملتان اور دیپال پور اسلامی تعلیم وثقافت کے مراکز کے طور پر ابھرے۔ البتہ جس شہر نے علمی اور تمدنی اعتبار سے سب سے زیادہ ترقی کی وہ لاہور تھا۔ یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ فتوحات غزنویہ کے بعد علماء اور مشائخ کے قافلے اس شہر کی طرف رجوع کرنے لگے، ان میں سے تفضل وتقدم شیخ اسماعیل محدث بخاری کو حاصل ہے۔ چنانچہ "تذکرہ علمائے ہند" میں اس حقیقت کے بارے میں یوں درج ہے:۔

> ان عظمائے محدثین ومفسرین بود اوّل کسی است کی علم حدیث وتفسیر بہ لاہور آوردہ

> یعنی آپ کا شمار عظیم محدثین اور مفسرین میں ہوتا ہے اور وہ پہلے شخص تھے جو علم تفسیر اور علم حدیث لاہور لیکر آئے۔ (۴)

عہد سلاطین (1206-1526ء) جو کہ غلاماں، خلجی، تغلق، سادات اور لودھی خاندان کے برصغیر پر مجموعی دور حکومت جو کہ تقریباً 320 سال کے عرصہ پر محیط تھا، پر مشتمل ہے۔ اس دور ایسے میں مقامی سازشوں اور غیر ملکی حملہ آوروں کے حملوں کی وجہ سے برصغیر کے تعلیمی نظام میں کئی مد و جزر آئے۔ اگرچہ اس عرصے میں یہاں کی تعلیمی سرگرمیوں میں غزنوی دور جیسی گرمجوشی نظر نہیں آتی تاہم علماء نے کونے کھدروں میں اِدھر اُدھر

سر چھپا کر غزنوی دور میں قائم ہونے والے نظام تعلیم کو کسی نہ کسی صورت میں جاری رکھا، مدارس میں صرف، نحو، معانی، فقہ، اصول فقہ، منطق، کلام، تصوف، تفسیر اور حدیث جیسے دینی اور دنیوی علوم پڑھائے جاتے رہے۔ ان میں سے نصف تعداد دنیوی علوم سے تعلق رکھتی تھی اور یہ علوم دینی علوم کی تحصیل میں ممد ومعاون سمجھے جاتے تھے۔ اس دور کی فضلیت یہ تھی کہ اس میں معیارِ فضلیت، فقہ اور اصول فقہ کو مقرر کیا گیا تھا۔ ہندوستان میں یہ علوم غزنی اور غور سے آئے تھے جہاں فلسفہ کے بجائے فقہ اور اصول فقہ میں ماہر ہونا وجہ فضلیت تھی یہی وجہ ہے کہ اس دور میں کتب فتاویٰ اور فقہی روایات کی کثرت تھی اور فقہی مسائل کو کتاب وسنت سے ثابت کرنے کی کوشش نہیں کی جاتی تھی اور نہ سنن ماثورہ سے فقہی مجتہدات کو منطبق کیا جاتا تھا۔ اس دور کے اہل علم کا انتہائی مبلغ علم حدیث صرف حسن صغانی کی مشارق الانوار پر مبنی تھا اور اگر کوئی اس سے آگے بڑھنے کی کوشش کرتا تو وہ بغوی کی مصابیح السنۃ کا مطالعہ کرتا تھا اور ایسے شخص کو وہ محدث سمجھتے تھے۔ ان کا یہ خیال علم حدیث سے ناواقفیت پر مبنی تھا۔ (۵)

نصاب تعلیم کی یہ صورتحال کوئی زیادہ اطمینان بخش نہ تھی، مشہور تاریخی واقعہ ہے کہ مصری عالم شیخ شمس الدینؒ محدث، سلطان علاء الدین خلجی کے عہد میں ملتان آئے۔ واپسی پر انہوں نے سلطان موصوف کو شکایت کے طور پر یہ خط لکھا کہ ان کے ملک کے علماء نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کو درخور اعتنا نہیں سمجھتے۔ (٦)

سکندر لودھی کے زمانے تک ہندوستان کے نصاب تعلیم میں منقولات کا زیادہ غلبہ تھا اور منطق اور علم الکلام کی صرف ایک دو کتابیں پڑھائی جاتی تھیں لیکن ازاں بعد معقولات کی تدریس کو خصوصی اہمیت دی جانے لگی۔ اکبر کے عہد میں بھی معقولات میں بہت اضافہ ہوا۔ اس کی بڑی وجہ ایران اور سمرقند سے بعض علماء کی آمد تھی، جنہوں نے منطق اور فلسفے کو پھر سے رواج دیا۔ (۷)

اکبری دور میں یہاں کے نصابِ تعلیم میں دوسری نمایاں تبدیلی یہاں حدیث کی تدریس کا رواج تھا۔ اس تبدیلی کی بڑی وجہ بعض ہندوستانی علماء کا حجازِ مقدس میں جا کر نامور ماہرین حدیث سے اکتساب فیض تھا۔ اس سلسلے میں محمد بن طاہر بن علی پٹنی صاحبِ مجمع البحار، شیخ یعقوب بن حسن کشمیری اور شیخ عبدالنبی گنگوہی کے نام نمایاں ہیں۔ ان میں سے بعض علماء مثلاً شیخ عبدالمعطی، شیخ عبداللہ اور شیخ رحمت اللہ واپس ہندوستان آئے تو گجرات میں قیام پذیر ہوگئے۔ ان کی کوششوں سے حدیث شریف کا علم یہاں رائج ہوا۔ بعض علماء دہلی اور آگرہ میں بھی آئے تھے۔ ان میں سیّد رفیع الدین شیرازی، شیخ بہلول بدخشی اور امیر کلاں کے دم قدم سے علم

حدیث کا چرچا ہوا۔(۸)

اگرچہ حدیث کی تدریس کا آغاز اکبر دور میں ہو گیا تھا لیکن جس شخص نے جہانگیری دور میں اس سلسلے کو آگے بڑھایا وہ شیخ عبدالحق بن سیف الدین محدّثِ دہلوی تھے۔تاہم یہ ایک حقیقت ہے کہ ان کی کوششوں کے نتیجے میں علم حدیث کی تعلیم ہندوستان کے بعض مخصوص علاقوں میں رائج ہو سکی جبکہ ہندوستان کے اکثر علاقے اس نئی تبدیلی سے نا آشنا رہے اور اہل علم زیادہ تر منطق اور فلسفہ پڑھانے ہی میں دلچسپی لیتے رہے۔(۹)

الغرض اکبری دور میں برصغیر میں شروع ہونے والا تیسرا تعلیمی دور اورنگ زیب عالمگیر کے ابتدائے حکومت (1068ھ/1658ء) تک جاری رہا جس میں بہر حال منطق اور فلسفہ کا بہت زیادہ چرچا تھا مگر اورنگ زیب کے زمانے ہی میں جو سب سے بڑا تعلیمی انقلاب آیا وہ اسلامی مدارس میں "درس نظامی" کے نام سے ایک نئے نصاب تعلیم کا آغاز تھا جس کے بانی ملّا نظام الدین سہالوی تھے۔(۱۰)

ملّا نظام الدین سہالوی

ملا نظام الدین سہالوی بانی درس نظامیہ، معتبر عالم دین، فقیہ، فلسفی، شارح اور ایک ممتاز مدرس، ۱۰۸۸-۱۰۸۹ھ/ ۱۶۷۷-۱۶۷۸ء میں، موجودہ اتر پردیش (بھارت) کے ایک قصبہ، سہالی میں پیدا ہوئے۔ان کا تعلق وہاں کے مشہور انصاری خاندان سے تھا اور ان کے جدامجد ہرات کے مشہور بزرگ شیخ عبداللہ انصاریؒ تھے۔ان کے اسلاف میں شیخ نظام الدین نے سہالی میں سلسلۂ درس وتدریس کا آغاز کیا، جن کے پڑپوتے شیخ حافظ کے زہد وعلم سے متاثر ہو کر شہنشاہ اکبر نے ان کے لیے اس علاقے میں معقول جاگیر دینے کا فرمان جاری کیا اور اس کی بدولت شیخ حافظ اور ان کی اولاد نے باطمینان فرائض درس ادا کیے اور اپنے طلبہ کے قیام وطعام کی بھی کفالت کی۔

ملا نظام الدین نے ابتدائی تعلیم اپنے والد ملا قطب الدین شہید سے حاصل کی۔سال ۱۱۰۳ھ/۱۶۹۱ء میں ملا قطب الدین کو سہالی کے شیخ زادوں نے شہید کر کے ان کے مکان کو مال واسباب اور کتاب خانے سمیت نذر آتش کر دیا اور ان کے چاروں بیٹے لکھنؤ چلے گئے۔اورنگ زیب عالمگیر نے اس خاندان کی علمی خدمات کا پاس کرتے ہوئے ۱۱۰۵ھ/۱۶۹۳ء میں، ایک فرمان کے ذریعے لکھنؤ کی ایک مشہور کوٹھی فرنگی محل انہیں عطا کر دی۔(۱۱) شیخ محمد اکرام کے مطابق:

فرنگی محل، لکھنؤ کا ایک محلّہ ہے جہاں ابتداً ایک فرانسیسی تاجر مقیم تھا، جس کے تعلق کی وجہ

سے یہ علاقہ "فرنگی محل" کہلاتا ہے۔ جب وہ تاجر اپنے وطن واپس چلا گیا تو یہ زمین "نزول" یعنی سرکاری ہوگئی۔ اورنگ زیب کے زمانے میں ملّا قطب الدین نے فروغ حاصل کیا۔ وہ قصبہ سہالی میں رہتے تھے، جہاں عثمانیوں اور انصاریوں میں زمینداری پر کچھ جھگڑا تھا۔ ۱۱۰۳ھ بمطابق 1691ء کی ایک رات چند عثمانی ملا قطب الدین انصاری گھر پر چڑھ دوڑے اور ملّا کو شہید کر کے ان کے گھر کو جلا دیا۔ ان کے صاحبزادے ملّا محمد سعید سہالوی نے عالمگیر کی خدمت میں حاضر ہو کر شکایت کی تو "فرنگی محل" کا علاقہ ان کو معافی میں دیا گیا۔ (۱۲)

ملا نظام الدین تحصیل علم کے لیے پورب کے قصبات میں چلے آئے۔ دیوا میں مولانا عبدالسلام، جائس میں ملا علی قلی، بنارس میں امان اللہ بن نور اللہ اور لکھنؤ میں شیخ غلام نقشبند کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا اور چوبیس برس کی عمر میں سند فضلیت پائی۔ اس کے بعد انہوں نے اپنے والد کی مسند سنبھالی اور جلد ہی ان کا نام شہرت کی بلندیوں پر پہنچ گیا۔ فرنگی محل علم وفن کا معدن بن گیا، جہاں سے آج تک علمی سلسلہ منقطع نہیں ہوا۔ کچھ عرصہ بعد انہوں نے تربیت باطنی کی ضرورت محسوس کی، چنانچہ تقریباً چالیس سال کی عمر میں شاہ عبدالرزاق بانسوی (م ۱۱۳۶ھ/۱۷۲۳ء) سے سلسلۂ قادریہ میں بیعت کی اور روحانی فیوض حاصل کی۔ انہوں نے اپنے مرشد کے حالات واقوال پر ایک مستقل کتاب "مناقب رزاقیہ" بھی تالیف کی تھی۔

ملّا نظام الدین کی طبیعت پر تبحر علمی کے باوجود بے نفسی اور تواضع کا غلبہ تھا، چنانچہ انہوں نے کبھی کسی سے مجادلہ یا مناظرہ نہ کیا۔ اقوال قدما پر ان کی نگاہ بڑی وسیع تھی۔ صاحب مآثر الکرام، غلام علی آزاد کا بیان ہے کہ "۹ ذوالحجہ ۱۱۴۸ھ/ ۱۷۳۵ء کو ان کی ملاقات کے لیے پہنچا تو ان کو ثقہ عالم پایا اور چہرے پر تقدس کے نشانات دیکھے"۔ وہ ایک عارف کامل اور صاحب وجد وحال بھی تھے، چنانچہ خلق کثیر نے ان کے ہاتھوں پر بیعت کی۔ ان کی زندگی کا بیشتر حصہ درس وتدریس اور تصنیف وتالیف میں صَرف ہوا اور ان کی نیک تربیت سے علما وفضلا کی بڑی جماعت تیار ہوئی۔ ان کی بیشتر تالیفات علوم حکمیہ اور اصول فقہ پر ہیں اور ان میں سے اکثر حواشی پر مشتمل ہیں۔ جن میں متقدمین کی علم کلام اور اصول فقہ وغیرہ پر مستند اور متداول تصانیف کے دقیق مسائل کی عام فہم انداز میں تشریح وتوضیح کی گئی ہے۔ اس سلسلے میں شرح الرسالۃ المبارزیہ فی عقائد، شرح مسلم الثبوت، شرح منار، شرح تحریر الاصول، حاشیہ علی شرح العقائد، حاشیہ علی الحاشیۃ القدیمہ، حاشیہ علی الصدرا، حاشیہ علی الشمس البازغۃ وغیرہ کا نام لیا جاسکتا ہے۔ ان کے مخطوطات بانکی پور، رام پور، علی گڑھ حیدر آباد دکن اور انڈیا آفس کے کتب خانوں میں محفوظ ہیں۔ انہوں نے ۷۵ برس کی عمر میں (چہار شنبہ ۹ جمادی الاولیٰ

۱۱۶۱ھ/ ۱۷۴۸ء) وفات پائی۔ ان کے اخلاف میں سب سے زیادہ شہرت ملا عبد العلی بحر العلوم نے پائی۔

درس نظامی کی تشکیل

ملا نظام الدین علمائے متاخرین میں بلند پایہ مقام رکھتے ہیں۔ ان کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے خود اسلامی علوم وفنون میں مہارت تامہ حاصل کر کے ان کی بہترین کتب کو باہم مربوط اور منظم صورت میں اس طرح مرتب کیا جس سے عربی علوم کا ایک جامع اور ہمہ گیر نصاب تشکیل ہوا، جو آج بھی ان کی نسبت سے "درس نظامی" کہلاتا اور تھوڑی بہت تبدیلیوں کے ساتھ مدارس عربیہ میں رائج ہے۔ اس نصاب میں ملا صاحب نے پہلی بار ہندوستانی علماء کی کتابوں کو شامل کیا، علاوہ ازیں انہوں نے اختصار کے اصول کو بڑی شدت کے ساتھ ملحوظ رکھا۔ ہر فن پر ایک سے زیادہ کتابیں رکھیں اور وہ بھی مختصر۔ پھر بعض کتابوں کے کچھ حصے شامل درس کیے۔ یہ طریقہ جدید نظریہ تعلیم کے عین مطابق ہے۔ ملا صاحب نے ہر فن کی مشکل ترین کتاب کو تدریس کے لیے منتخب کیا تاکہ طلباء میں گہرے غور وفکر اور عمیق مطالعے کا ذوق نشو ونما پائے۔ اسی طرح ان میں فکری توازن پیدا کرنے اور کسی مخصوص مسلکی تعصب سے بچانے کے لیے منقولات (۱۳) کے ساتھ معقولات (۱۴) کی تعلیم پر بھی زور دیا۔ اس اہتمام سے جو نصاب تعلیم تیار ہوا وہ گیارہ اہم علوم وفنون پر مشتمل تھا، جس میں حسب ذیل ترتیب سے کتابیں تجویز پائیں۔

1۔ علم الصرف

نمبر شمار	منصف	کتاب
۱۔	سراج الدین اودھی	میزان الصرف
۲۔	حمید الدین احمد کاکوری	منشعب
۳۔		پنج گنج
۴۔	مفتی عنایت احمد کاکوری	علم الصیغۃ
۵۔	سید علی اکبر انصاری	فصول اکبری
۶۔	ابن حاجب	شافیہ

2۔ علم النحو

۱۔	شریف الجرجانی	نحو میر
۲۔	عبد القاہر الجرجانی	نظم مائۃ عامل مع شرح

۳۔	ابوحیان الاندلسی	ہدایۃ النحو
۴۔	ابن الحاجب	کافیہ
۵۔	جامی:	الفوائد الضیائیۃ (شرح کافیہ)

4۔ منطق

نمبر شمار	مصنف	کتاب
ا۔	شریف الجرجانی	صغریٰ، کبریٰ
۲۔	الابہری	مختصر ایساغوجی۔
۳۔	التفتازانی	تہذیب المنطق والکلام
۴۔	عبداللہ یزدی	شرح تہذیب
۵۔	قطب الدین رازی	قطبی (شرح الرسالۃ الشمسیہ)
۶۔	شریف الجرجانی	میر قطبی
۷۔	محب اللہ بہاری	سُلّم العلوم

5۔ حکمت وفلسفہ

ا۔	قاضی میر حسن میبذی	میبذی (شرح ہدایۃ الحکمۃ از الابہری)
۲۔	ملاصدرا	شرح ہدایۃ الحکمۃ
۳۔	محمود جونپوری	شمس بازغۃ

6۔ ریاضی (ہیئت وہندسہ)

ا۔	العاملی	خلاصۃ الحساب والھندسۃ۔
۲۔	الطوسی	اصول الہندسۃ الاقلیدس (مقالہ اولیٰ)
۳۔	وہی مصنف	تشریح الافلاک
۴۔		رسالۃ قوشجیہ
۵۔	موسیٰ رومی	شرح چغمینی، باب اوّل

7۔ علم بلاغت

ا۔	التفتازانی	مختصر المعانی
۲۔	وہی مصنف	مطول (تا ما انا قلت)

8۔ فقہ

ا۔	عبداللہ ابن مسعود	شرح وقایہ
۲۔	المرغینانی	ہدایۃ (کامل)

9۔ علم اصول فقہ

نمبر شمار	مصنف	نام کتاب
ا۔	ملاجیون	نورالانوار
۲۔	عبداللہ بن مسعود	التوضیح فی حل غوامض التنقیح
۳۔	التفتازانی	التلویح
۴۔	محب اللہ بہاری	مسلم الثبوت (مبادی کلامیہ)

10۔ علم الکلام

ا۔	النسفی	العقائد النسفیہ (مع شرح التفتازانی)
۲۔	الدوانی	شرح العقائد العضدیہ۔

11۔ تفسیر قرآن

ا۔	المحلی والسیوطی	تفسیر جلالین
۲۔	البیضاوی	انوار التنزیل واسرار التاویل

یہاں یہ امر قابل ذکر ہے کہ مذکورہ بالا نصاب تنہا ملا صاحب کا مرتب کردہ نہیں۔اس کی اساس ان کے والد رکھ چکے تھے اور ان کے بعد اس میں ان کے جانشینوں نے بہت سے اضافے کیے۔بہرحال اس نصاب تعلیم کا سب سے بڑا مقصد یہ تھا کہ طالب عالم میں اتنی صلاحیت پیدا ہو جائے کہ اسے ختم کرنے کے بعد وہ دیگر کتب کے مطالعے اور انہیں بخوبی سمجھنے پر قادر ہو جائے۔نصاب کو مختصر اور جامع رکھنے سے مطلوب یہ تھا کہ ایک متوسط ذہن کا طالب علم سولہ سترہ برس کی عمر میں فارغ التحصیل ہو جائے۔فقہ پر اصول فقہ کی بہ نسبت کم کتابیں تجویز کرنے کا مقصد یہ تھا کہ علماء میں تعصب اور تقشف کم سے کم ہو اور مثبت انداز فکر پیدا ہو،جس سے ایسے بارسوخ اور اہل فکر و تحقیق علماء پیدا کیے جائیں جو اس دور زوال میں مسلمانوں کے مذہبی علوم کی فکری اور نظری سطح پر مدافعت کر سکیں۔اس نصاب میں پہلی بار تصوف و سلوک کو نصاب سے خارج کیا گیا،جس کی وجہ غالباً یہ تھی کہ ملا نظام الدین کی رائے میں اس وقت تک ان کتابوں کا مطالعہ مفید نہیں ہو سکتا جب تک مرشد

کامل کی رہنمائی میسر نہ ہو۔ یہ ایک ایسا اقدام تھا جس کے باعث تصوف وسلوک سے بُعد بڑھتا چلا گیا۔ اس میں شبہ نہیں کہ اس نصاب میں کچھ کمزوریاں بھی ہیں، لیکن یہ اتنی شدید نہیں کہ ان کی بنیاد پر سارے نصاب تعلیم ہی کی نفی کر دی جائے۔ وقتاً وقتاً ان کمزوریوں کو دور کرنے کی کوششیں ہوتی رہی ہیں، مثلاً ادب کی کمی کو رفع کرنے کے لیے بہت سی قدیم وجدید کتابوں کو شامل کیا گیا۔ علم حدیث کی بہتر تدریس کے لیے شاہ ولی اللہؒ کے زیر اثر درس نظامی کے آخری سال کو دورۂ حدیث شریف کا سال قرار دیا گیا، جس میں صحاح ستہ، بلکہ عشرہ متداولہ، کی تعلیم بھی ضروری قرار پائی۔ اسی طرح دور جدید کے بعض مدارس میں دورۂ قرآن کو بھی اختیار کیا گیا ہے، چنانچہ وہاں قرآن مجید کا مکمل ترجمہ تفسیر کے ساتھ پڑھایا جاتا ہے۔ درس نظامی میں حکمت وفلسفہ اور منطق قدیم پر کتب کو شامل کرنے کی غایت یہ تھی کہ موجودہ زمانے کے علماء کا متقدمین کے ساتھ فکری اور نظریاتی رابطہ منقطع نہ ہو۔ ان علوم کو علوم دینیہ میں ہرگز شامل نہیں سمجھا جاتا، بلکہ ان سے علوم دینیہ کی خدمت اور ذہنی سطح کو بلند کرنے کا کام لیا جاتا رہا ہے۔ (۱۵)

ملا نظام الدین سہالوی دینی تدریسی نصاب کی ترتیب وتشکیل کے حوالے سے اس اعتبار سے بھی نمایاں اور معتبر ہیں کہ انہوں نے نہ صرف درس نظامی کا نصاب وضع کیا بلکہ اپنے وضع کردہ نصاب کو ابتدائی طور پر اپنے نوتشکیل شدہ مدرسہ عالیہ نظامیہ فرنگی محل لکھنؤ میں نافذ بھی کیا۔ (۱۶)

اس وقت دینی مدارس میں جو نصاب تعلیم رائج ہے اگر چہ "درس نظامی" ہی ہے، لیکن دراصل یہ اس کی ترمیم شدہ اور ترقی یافتہ شکل ہے۔ اس میں علوم وفنون کی تعداد سترہ تک جا پہنچی ہے اور معقولات کے بجائے زیادہ زور منقولات پر دیا جاتا ہے۔ جامعیت اور ادبی وفکری اعتبار سے اس کا پایہ بلند ہو چکا ہے، تاہم اس پر نظر ثانی اور اسے جدید تر کرنے کی ضرورت ہمہ وقت موجود رہتی ہے۔ مولانا محمد یوسف بنوریؒ نے اصلاح نصاب کے لیے تین تجاویز پیش کی تھیں، یعنی

(۱) تخفیف: نصاب کو مختصر بنایا جائے تاکہ اس سے فراغت میں آسانی ہو اور اس کے بعد مختلف علوم میں تخصص کے درجات رکھے جائیں انہوں نے تخصص کے لیے جو شعبے تجویز کیے وہ یہ تھے:۔

۱۔ علوم قرآن وتفسیر	۲۔ علوم حدیث
۳۔ علوم ادب وتاریخ	۴۔ فقہ واصول فقہ (نیز افتا وقضا)
۵۔ علم التوحید (فلسفہ ومعقولات)	۶۔ علم معاشیات واقتصادیات
۷۔ علم اخلاق وتصوف	

(۲) تیسیر: درس یا نصاب میں آسانی پیدا کی جائے۔اس میں پیچیدہ اور غامض کتابوں کے بجائے آسان اور سریع الفہم کتابیں تجویز کی جائیں تا کہ خواہ مخواہ کی موشگافیاں نہ کی جائیں۔ان کی رائے میں متاخرین کے بجائے متقدمین کی تصانیف کو ترجیح دینی چاہیے۔

(۳) محو واثبات یا اصلاح وترمیم: یعنی غیر اہم فنون کو ساقط کر کے جدید اور مفید علوم کو جگہ دی جائے۔نصاب میں قرآن مجید، علوم حدیث، تاریخ اسلام، سیرت النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، ادب اور بلاغت کو اولین اہمیت دینی چاہیے۔عربی ادبی زبان میں گفتگو، خطابت اور انشا پر زور دیا جائے اور جدید علم کلام، ریاضیات اور معاشیات کا معتد بہ اضافہ ہو۔(۱۷)

الغرض پاک وہند کے دینی مدارس میں مروج درس نظامی میں، جس کی بنیاد بارہویں صدی ہجری/ سترھویں، اٹھارویں صدی عیسوی کے معتبر عالم دین ملا نظام الدین سہالوی (متوفی ۳ جمادی الاولی ۱۱۶۱ھ/ ۱۷۴۸ء) نے رکھی تھی، امتداد زمانہ کے ساتھ، وسائل کی کمی کے باوجود، اس میں اصلاح کی کوشش ہوتی رہیں۔یہ سلسلہ جاری ہے۔مثال کے طور پر ملا نظام الدین سہالوی کے تجویز کردہ نصاب میں علوم حدیث کے لیے صرف مشکوٰۃ المصابیح کو نصاب میں شامل کیا گیا تھا لیکن بعد میں اس میں شرح نخبۃ الفکر اور صحاح ستہ کو بھی شامل کرلیا گیا۔اسی طرح فقہ میں کنز الدقائق کا اضافہ کیا گیا۔عربی ادب کی بعض کتب مثلاً: نفحۃ العرب، سبعۃ معلقات، دیوان المتنبی، دیوان الحماسہ، مقالات (حریری) بھی پڑھائی جاتی ہیں۔(۱۸)

درس نظامی کی خصوصیات:

درس نظامی کے بعض ناقدین نے اس کی خوبیوں اور خامیوں کی نشاندہی یوں کی ہے:۔

خوبیاں

i۔ درس نظامی کے نصابات کا بنیادی فلسفہ یہ تھا کہ نصاب میں پڑھائے جانے والے علوم وفنون کے لیے مشکل سے مشکل متون شامل کیے جائیں تا کہ طالب علم ان متون کے مطالعہ سے علم کے ہر فن میں تاک ہو جائیں۔

ii۔ اس نصاب میں اس دور کی علمی فضا کو سامنے رکھ کر فلسفہ، منطق وغیرہ پر زیادہ توجہ دی گئی تا کہ طلباء میں کوئی علمی خامی نہ رہے۔

iii۔ نصاب میں معاصر اور مقدم علماء کی کتابیں شامل کی گئیں جس سے طلباء پوری علمی دنیا سے متعارف

ہوئے۔

iv۔ اس نصاب کے ذریعے پہلی دفعہ ہندوستانی علماء کی تصانیف کو داخل نصاب کیا گیا ورنہ اس سے پہلے کسی بھی ہندوستانی عالم کی کوئی بھی تصنیف اسلامی مدارس کے نصاب میں شامل نہ کی گئی تھی۔

v۔ نصاب مختصر ہے جسے طالب مختصر عرصہ اور کم عمری میں ختم کر سکتا ہے۔

vi۔ اس نصاب کی بڑی خوبی یہ ہے کہ اس سے طلباء کے ذہن میں فقہی تعصب پیدا نہیں ہوتا۔

vii۔ اس نصاب میں معاصر علماء کی تصانیف شامل کر کے معاصرت کا مرض ختم کرنے کی عمدہ کوشش کی گئی۔

viii۔ اس نصاب میں وقت نظر مطالعہ کو بڑی اہمیت دی گئی۔

خامیاں

i۔ نصاب میں معلومات کی وسعت کے بجائے فہم اور تدبر وفکر پر زیادہ زور دیا گیا۔

ii۔ منقولات کی نسبت معقولات کو زیادہ اہمیت دی جاتی رہی جس کی وجہ سے نصاب مجموعی طور پر بوجھل ہوتا گیا۔

iii۔ تاریخ وجغرافیہ کو اس نصاب میں یکسر نظر انداز کر دیا گیا اور صرف ونحو پر زیادہ زور دیا گیا۔ ان علوم کی متعدد کتابیں شامل نصاب تھیں جبکہ ادب پر بہت کم توجہ دی گئی۔ اس سلسلے میں صرف تین یا چار کتابیں شامل نصاب تھیں۔ اس نصاب میں علم حدیث کی تدریس بھی نہایت کمزور تھی۔ یہ صرف مشکوٰۃ شریف نصاب تھی جس کے پیچھے یہ نظریہ تھا کہ طلباء اس کے پڑھنے کے بعد ذاتی مطالعہ سے حدیث کے دوسرے مجموعے پڑھنے اور سمجھنے کے قابل ہو جاتے ہیں۔(۱۹)

عہد عالمگیری کے بعد شاہ ولی اللہ نے اکبری دور سے جاری نصابات میں بہت اہم ترمیمات کیں اور کتابوں کی ترتیب کو بہت حد تک بدلا۔ انہوں نے اپنے رسالہ الجزء اللطیف میں اپنی درسیات کو اس ترتیب سے لکھا ہے۔

نحو	منطق	فلسفہ	کلام	فقہ
اصول فقہ	بلاغت	ہیأت وحساب	طب	حدیث (۲۰)

انیسویں صدی کے اواخر تک پاک وہند میں مسلمانوں کے نظام تعلیم میں کوئی تبدیلی نہ آسکی۔ اس چٹان کو پہلی بار علی گڑھ تحریک کے بانی سرسیّد نے توڑا جس نے جدید اور سائنٹیفک تعلیم کی ضرورت کا پسماندہ

ملت کے لیے احساس کرایا۔ پھر متعدد مسلمان مفکرین اور مصلحین نے مدرسوں کے نظام کی اصلاح پر زور دیا۔ شبلی کا خیال تھا کہ مذہب کو خارج کر کے یکسر جدید تعلیم دینے کی علی گڑھ والی کوشش اور سائنٹیفک تعلیم چھوڑ کر قطعی مذہبی تعلیم دینے کا دیوبند والا انداز دونوں غلط ہیں۔ مدرسہ کو بہر طور پر دین و دنیا کا جامع ہونا چاہیے۔

۱۸۵۷ء کے ہنگامے کے بعد جب انگریزوں کے قدم ہندوستان کی سرزمین میں مضبوطی کے ساتھ جم گئے تو مسلمان مفکرین کو محسوس ہوا کہ اب سیاسی زوال وانحطاط کے ساتھ مسلمانوں کے دین و مذہب اور ان کی قومی زندگی کی بھی خیر نہیں ہی، کیونکہ تاریخ کی مسلسل شہادتوں کے مطابق جب کوئی قوم کسی ملک کو فتح کرتی اور اس ملک کے باشندوں پر سیاسی غلبہ واستیلاء پالیتی ہے تو فاتح قوم کا اثر ونفوذ صرف مفتوح اقوام کے جسموں تک محدود نہیں رہتا بلکہ وہ ان کے دلوں اور دماغوں کو بھی تسخیر کر لیتی ہے اور اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ مفتوحہ اقوام اپنے قومی خصائص وروایات اور ملی شعائر وعلامات کو نہ صرف یہ کہ نظر انداز کر دیتی ہیں بلکہ ایک مدت تک عملِ تجاذب کے مسلسل جاری رہنے کے باعث آخر کار وہ ان سے نفرت کرنے لگتی ہیں اور اب ان کے لیے فاتح قوم کی نقالی اور کورانہ تقلیدی سرمایۂ افتخار رہ جاتی ہے۔ ہندوستان کے بیدار مغز مسلمان اربابِ فکر وعلم نے اس خطرہ کو اسی وقت احساس کر لیا اور اس کا سدِ باب کرنے کے لیے انہوں نے سب سے پہلے مسلمانوں کی تعلیم کی طرف توجہ کی۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ مسلمان اربابِ فکر کا یہ اقدام نہایت عاقبت اندیشی اور دور بینی پر مبنی تھا، کیونکہ سیاسی طاقت وقوت سے محروم ہو جانے کے بعد تعلیم کے سوا کوئی اور ایسی چیز باقی نہیں رہ گئی تھی جس کے ذریعہ مسلمان اپنی قومیت کا تحفظ کر سکتے اور مغلوب ومحکوم ہونے کے باوجود بحیثیت ایک قوم کے زندہ رہ سکتے۔ لیکن اس ایک ضرورت کے احساس میں شریک ہونے کے باوصف خود اربابِ فکر میں دو طبقے ہو گئے۔ ایک طبقہ جو علماء کرام کا تھا اس نے اپنی تمام تر توجہ قدیم نصاب درس کی تعلیم پر مرکوز کر دی۔ اس مقصد کے لیے عربی مدارس قائم کیے گئے اور ان کے ذریعہ دینیات یعنی تفسیر، حدیث، فقہ اور ان کے ساتھ عربی زبان سے متعلق بعض اور عقلی فنون کی تعلیم کا ذوق پیدا کرنے کی کوشش کی گئی۔ آج کل کی عام اصطلاح میں اس طبقہ کو قدیم تعلیم یافتہ گروہ کہتے ہیں جس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ یہ گروہ علم اور عمل، وضع اور سیرت دونوں کے لحاظ سے بالکل قدیم ہے۔ اس کے برخلاف دوسرا طبقہ متجددین کا تھا۔ یہ وہ لوگ تھے جنہوں نے مسلمانوں کی خیریت اسی میں سمجھی کہ مسلمان انگریزوں کی زبان اور ان کے علوم وفنون کو سیکھیں اور صرف اتنا ہی نہیں بلکہ تہذیبی اور تمدنی لحاظ سے بھی انہیں کے رنگ میں رنگے جائیں۔ اس گروہ کو عام بول چال میں جدید تعلیم یافتہ گروہ کہتے

ہیں اور اس کی وجہ تسمیہ ظاہر ہے کہ یہ لوگ چال ڈھال، وضع قطع اور فکر و دماغ کے اعتبار سے علماء کے گروہ کی ضد ہیں۔ بہر حال اس طرح مسلمانوں میں تعلیم کی دو قسمیں ہوگئیں۔ ایک قدیم اور دوسری جدید۔ ان دونوں قسم کی تعلیم کے لیے درسگاہیں بھی الگ الگ قائم ہوئیں تعلیم جدید کی درس گاہ اسکول، کالج کہلائی اور قدیم تعلیم کی درس گاہ کا نام وہی پُرانا مدرسہ رہا۔ اگر چہ یہ دونوں درس گاہیں مسلمانوں کی تھیں اور ان کی کسی ایک نہ ایک ضرورت کی تکمیل کرتی تھیں۔ لیکن یہ امر نہایت افسوسناک تھا کہ دونوں میں ایک طرح کی رقابت اور چشمک زنی پیدا ہوگئی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ قدیم تعلیم یافتہ حضرات کو جدید گروہ سے نفرت تھی اور اسی طرح جدید گروہ قدیم تعلیم کے اصحاب کی شکل دیکھنے کا روادار نہ تھا، یہ صورتِ حال ایک عرصہ تک قائم رہی۔ بلکہ لمحہ موجود تک جاری رہی۔

۱۹۲۰ء میں تحریک خلافت کا زور ہوا تو اس تحریک نے علماء اور انگریزی تعلیم یافتہ دونوں طبقوں کو ایک پلیٹ فارم پر لاکر کھڑا کر دیا۔ اور اب دونوں طبقوں کی باہمی کشمکس اور آویزش خود بخود کم ہونے لگی۔ آپس کے میل جول باہمی تبادلہ خیالات وطنی اور ملکی سیاسیات، بین الاقوامی حالات سے واقفیت ان تمام چیزوں کا ایک نہایت اچھا اثر یہ ہوا کہ ہر طبقہ کو اپنی خامیوں اور کوتاہوں کا احساس پیدا ہوگیا۔ اس سلسلہ میں کبھی مسلم یونیورسٹی کے حلقہ سے آواز اٹھی کہ مسلمانوں کو مغرب کی کورانہ تقلید نے ایک نہایت خطرناک راستہ پر ڈال دیا ہے۔ ان کے نصاب تعلیم میں اسلامیات و دینیات کو غیر معمولی اہمیت ہونی چاہیے۔ اسی طرح علماء کرام کی زبان سے یہ بارہا سننے میں آیا کہ مدارس عربیہ کے نصاب تعلیم سے قدیم فلسفہ یونان وغیرہ ایسی غیر ضروری چیزوں کو خارج کر کے ان کی جگہ جدید علوم عصریہ کو شامل کرنا چاہیے۔ مسلم یونیورسٹی کے حلقہ میں اصلاح کا جو نعرہ بلند ہوا تھا، اس نے جامعہ ملیہ اسلامیہ کی شکل میں جنم لیا اور ادھر اصلاح نصاب عربی سے متعلق علماء کرام کے جو خیالات تھے وہ "ندوۃ العلماء" کے محسوس پیکر میں ظاہر ہوئے۔ اب اس وقت یہی چار درس گاہیں ہیں جو مسلمانانِ ہند کی تعلیم کے مرکزی ادارے سمجھے جاتے ہیں، خالص دنیوی درسگاہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، خالص دینی درس گاہ دارالعلوم دیوبند، دینی مگر دنیوی درس گاہ ندوۃ العلماء لکھنؤ، دنیوی مگر دینی درس گاہ جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی۔

لیکن ذرا غور سے دیکھیے تو صاف طور پر معلوم ہوتا ہے کہ حالات میں اب بھی کوئی خوشگوار تبدیلی پیدا نہیں ہوئی یہی وجہ ہے کہ مسلمانانِ ہند کی تعلیمی مشکلات کا حل اب تک زعمائے اسلام کی توجہ کا مرکز بنا ہوا ہے، بلکہ سچ یہ ہے کہ مسلمانوں کی تعلیمی اصلاح کی ضرورت اس شد و مد کے ساتھ پہلے کبھی محسوس نہیں کی گئی جتنی کہ

اب کی جاتی ہے۔لیکن افسوس ہے کہ ان سب امور کے باوجود مسلمانوں کی تعلیمی مشکلات کا کوئی خاطر خواہ حل دستیاب نہیں ہوسکا ہے اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ مسلمانوں نے مستقبل کے لیے اپنی تعلیم کا خاکہ مرتب کرتے وقت کبھی اپنی گذشتہ تعلیم کا پورا نظام پیش نظر نہیں رکھا۔ ورنہ ان پر یہ حقیقت مخفی نہ رہتی کہ گذشتہ تاریخ کے ہر دور میں مسلمانوں کا نصاب تعلیم ایک ہی رہا ہے جو علوم دینیہ اور دنیویہ دونوں پر مشتمل ہوتا تھا، علوم دینیہ سے مراد تفسیر وحدیث اور فقہ اور ان کے لوازم مبادی ہیں اور علوم دنیویہ سے مراد وہ علوم ہیں جن کا ہر زمانہ میں چرچا اور رواج رہا ہے اور جن کا پڑھنا پڑھانا، تہذیبی وتمدنی، اقتصادی اور سیاسی مسائل میں فکری یا عملی طور پر ممد ومعاون ثابت ہوتا ہے۔اگر مسلمان اپنی گذشتہ تعلیم کے اس خاکہ کو پیش نظر رکھیں اور پھر اس کی روشنی میں مستقبل کے لیے کوئی نظامِ تعلیم مرتب کریں تو ان کی بہت سے مشکلات اور بہت سے وساوس وشبہات خود بخود رفع ہو جاتے ہیں۔(۲۱)

عصری تقاضے:

اب صورت حال یہ ہے کہ اگر چہ مسلمان طلباء کی بھاری اکثریت جدید یونیورسٹیوں اور کالجوں میں داخلہ لیتی ہے۔مگر اب بھی پاکستان کے طول وعرض میں کئی ہزار مدرسے ہیں جہاں درس نظامی کی تعلیم دی جاتی ہے اور کم وبیش 20 لاکھ طلبہ ان مدارس کے ساتھ منسلک ہیں۔طلباء ملت کے مختلف طبقوں اور زندگی کے مختلف شعبوں سے آتے ہیں۔لیکن اکثریت غریب یا یتیم طلبہ کی ہوتی ہے، جو اسکولوں، کالجوں کی ماڈرن تعلیم کا خرچ برداشت نہیں کر سکتے۔مگر یہ تعلیم بہت سے سماجی اور اقتصادی مسائل کا سبب بن رہی ہے۔وہ طلباء جوان مدارس سے تعلیم مکمل کر کے نکلتے ہیں نہ کسی سرکاری ملازمت کے لیے اپنے آپ کو پیش کر سکتے ہیں اور نہ کوئی اور معمولی کام انہیں مل سکتا ہے۔حکومت کی طرف سے بھی وسیع پیمانے پر کسی مذہبی نوکری کا انتظام نہیں۔نتیجے کے طور پر وہ مفتی، مولوی، پیش امام، مؤذن یا پھر ان ہی مدرسوں کے مدرس بن جاتے۔بہت سے واعظ کا پیشہ اختیار کر لیتے ہیں۔کچھ سیاست میں شامل ہو جاتے ہیں اور فرقہ وارانہ سیاسی پارٹیوں کے ممبر بن کر ازمنہ وسطیٰ کے سیاسی نظریوں کا احیاء کرنے لگتے ہیں۔معاشرہ ان کی کوئی ضرورت پوری نہیں کرتا اور وہ معاشرہ کی کوئی ضرورت پوری نہیں کرتے۔سوائے مذہبی معنی کے۔

اس مرحلے پر خاص کر طبقہ علماء کو یہ کوشش کرنی چاہیے کہ مسلم تعلیم کی یہ دوعملی اور ثنویت پاکستان میں ختم کر دی جائے۔جدید نصابات جن میں تاریخ، جغرافیہ، ریاضیات، سائنس، کمپیوٹر ٹیکنالوجی اور جدید زبانیں شامل ہوں ان مدرسوں میں جاری کر دیئے جائیں۔ساتھ ہی فقہ، حدیث، تفسیر، اسلامی تاریخ اور عربی زبان

وادب کو برقرار رکھا جائے۔تا کہ طالب علم جدید تعلیم کے ساتھ قدیم اسلامی تعلیم بھی حاصل کرتا رہے اور یہ انداز تعلیم کچھ مشکل نہیں ہے۔مدارس کا اسلامی ماحول بھی برقرار رہے گا۔اسلامی تعلیم بھی دی جائے گی اور ساتھ ساتھ جدید تعلیم بھی۔تبدیلی کا یہ انداز خود علماء کرام کی طرف سے شروع ہونا چاہیے۔حکومت بھی آگے بڑھ کر اس کام میں ہاتھ بٹائے اور ان مدرسوں کی مدد کرے جو اپنے نصابات کو جدید انداز دینا چاہیں گے۔ رفتہ رفتہ ایسے مدارس جو تجدید کر چکے ہوں گے، حکومت اور متعدد تعلیمی بورڈوں کی طرف سے تسلیم کر لیئے جائیں گے۔کچھ کو پرائمری سکولوں کے درجہ میں، کچھ کو سیکنڈری سکولوں کے درجہ میں، کچھ کالجوں کی سطح پر اور اعلیٰ سطح کے مدارس کو یونیورسٹیوں کی سطح پر منظور کیا جائے گا۔

اس طرح ان مدرسوں کو تعلیم و تدریس کے جدید اداروں میں تبدیل کیا جا سکے گا اور غریب مسلمان طلباء مفت تعلیم پا سکیں گے اور پاکستان کے مفید شہری بن سکیں گے۔

۱۹۷۹ء میں ڈاکٹر عبدالواحد ہالے پوتا، ڈائریکٹر ادارہ تحقیقات اسلامی، اسلام آباد کی سربراہی میں علماء دین اور ماہرین تعلیم پر مشتمل ایک "قومی کمیٹی برائے دینی مدارس" تشکیل دی گئی تھی جس نے اپنی سفارشات میں دینی مدارس کے معیار تعلیم کو بہتر بنانے کے لیے درس نظامی کے روایتی مضامین کے ساتھ موزوں حد تک جدید مضامین کا اضافہ تجویز کیا تھا۔"درجہ متوسطہ "(میٹرک) میں جنرل ریاضی، جنرل سائنس، مطالعہ پاکستان، انگریزی اور درجہ عالیہ (بی اے) میں معاشیات، سیاسیات اور انگریزی میں سے دو مضامین کے اضافہ کی تجویز کی۔یہ سفارش بھی کی گئی کہ تدریس کے دوران مضامین درس نظامی کو دو تہائی اور سکول مضامین کو ایک تہائی وقت دیا جائے تا کہ اس امتزاج کے دوران دینی علوم کی تدریس متاثر نہ ہو۔اس کے ساتھ ہی یہ سفارش بھی کی گئی کہ کالجوں اور یونیورسٹیوں میں علوم عربیہ اور علوم اسلامیہ کے نصاب کو دینی مدارس کے نصاب کے ساتھ ہم آہنگ کیا جائے۔(۲۲)

کمیٹی نے دینی مدارس کے جملہ امور کو مربوط کرنے کے لیے خود مختار "قومی ادارہ برائے دینی مدارس پاکستان" کی تشکیل کی بھی سفارش کی جو مدارس کے امتحانات نتائج کے اعلان، اسناد کی تقسیم، نصاب کی تدوین ونظر ثانی جیسے اہم امور انجام دے۔یہ ادارہ مدارس، اساتذہ اور طلباء کی فلاح و بہبود کے لیے بھی کام کرے۔(۲۳)

بوجوہ ان سفارشات پر عملدرآمد نہ ہو سکا مگر مختلف مسالک کے مدارس کی تنظیمیں اور وفاق یونیورسٹی گرانٹس کمیشن کی طرف سے درجہ استناد کے مستحق قرار دیئے گئے اور ان کی شہادۃ العالمیہ کے حاملین کو تعلیم

وتحقیق کی سطح پر ایم اے عربی/علوم اسلامیہ کے مساوی تسلیم کرلیا گیا۔

قیام پاکستان کے بعد پاکستان کے دینی مدارس میں مروج درس نظامی پر نظر ثانی کی ضرورت کو خود علماء دین نے بھی محسوس کیا۔ چنانچہ مفتی سیاح الدین کاکاخیل مرحوم نے انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی سٹڈیز، اسلام آباد کے زیر اہتمام ۲۳،۲۴ نومبر ۱۹۸۶ء کو منعقد کیے گئے ایک سیمینار میں اس موضوع پر اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا:

> درس نظامی کی کتابوں میں اگر حالات کے اعتبار سے بعض کتابیں اب خارج کی جائیں اور بعض اور مفید کتابیں جن کا شامل نصاب کرنا حالات زمانہ کے اعتبار سے ضروری ہو شامل کی جائیں تو اس کے کوئی خاص فرق نہیں پڑے گا اور یہ نہ اسلاف کے طریقہ سے روگردانی ہوگی اور نہ یہ ضروری ہے کہ وہ فوائد فوت ہوجائیں گے جو درس نظامی کے پڑھنے سے حاصل ہوتے ہیں(۲۴)

اسی سیمینار سے خطاب کرتے ہوئے مولانا عبدالغفار حسن نے حسب ذیل خیالات کا اظہار فرمایا:

> اس میں کوئی شک نہیں کہ موجودہ مدارس کے فارغ التحصیل طلبہ دینی اور عصری قیادت کے تقاضے کما حقہ پورا کرنے سے قاصر ہیں۔ نصاب میں جدید وقدیم کے حسین امتزاج کی شدید ضرورت ہے(۲۵)۔

مولانا سیّد متین ہاشمی کے مطابق:

> دینی مدارس سے فارغ ہونے والے افراد کے لیے امام مسجد اور خطیب ہونا ہی کافی نہیں بلکہ انہیں تمام شعبہ ہائے حیات میں مؤثر کردار ادا کرنا چاہیے اور اس کے لیے مدارس کے نظام میں تبدیلی کی اشد ضرورت ہے۔ موجودہ مدارس سے فارغ ہونے والے طلبہ میرے خیال میں صحیح معنوں میں خطیب بھی نہیں ہوتے صرف چند روایات اور اختلافی مسائل کے حافظ ہوتے ہیں اور امت میں افتراق وانتشار پیدا کرتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ قرآن وسنت کا جو صحیح علم ہونا چاہیے باوجود آٹھ دس سال لگانے کے ان کی دسترس میں وہ علوم نہیں آتے، اس لیے کہ ان کے آٹھ سالہ دورِ تعلیم میں ان کے چھ سال صرف علوم کی تحصیل پر صرف ہوتے ہیں۔ ساتویں سال میں وہ "موقوف علیہ" پڑھتے ہیں اور آٹھویں سال میں "دورۂ حدیث" "موقوف علیہ میں وہ صرف جلالین شریف پڑھتے ہیں جسے تفسیر سے زیادہ ترجمہ کہنا چاہیے اور بعض مدارس میں تبرکاً

تفسیر بیضاوی جو صرف سورۃ بقرۃ تک پڑھائی جاتی ہے متداول ہے۔ حدیث کی صرف ایک کتاب مشکوٰۃ پڑھائی جاتی ہے اور اس کے پڑھانے کا طرز یہ ہے کہ اختلافی مسائل مثلاً آمین بالجہر، رفع یدین اور قرأت خلف الامام پر طویل بحثیں ہوتی ہیں۔ ان بحثوں کا نتیجہ یہ ہے کہ علم حدیث جو حقیقی معنوں میں علم الاخلاق، علم الاقتضاء، عمرانیات، علم المعاملات اور علم الاعتقاد کا جامع ہے۔ محض چند فروعی مسائل کا مجموعہ معلوم ہوتا ہے اس سے طلبہ میں کج بحثی اور فرقہ واریت پیدا ہوتی ہے۔ دورۂ حدیث کا مطلب میرے خیال میں "دوڑو" ہے۔ یعنی چند اختلافی مباحث کے سوا شاگرد خاموش بیٹھا رہتا ہے اور استاد حدیث کی تلاوت کرتا جاتا ہے اس طرح کتاب ختم ہو جاتی ہے۔ چونکہ امتحان میں وہی اختلافی مسائل پوچھے جاتے ہیں اس لیے شاگرد پوری کوشش اور محنت سے دلائل اور مخالف حدیث کی توجیہات یاد کرتا ہے اور پھر اسے "سند الفراغ" دے دی جاتی ہے۔ درس نظامی کا موجودہ نصاب اس زمانے کی ضروریات اور تقاضوں کو پیش نظر رکھ کر بنایا گیا تھا۔ جس زمانے می اس کی تدوین ہوئی تھی۔ اب حالات یکسر تبدیل ہو چکے ہیں۔ اس لیے نصاب کو بھی تبدیل ہونا چاہیے۔ (۲۶)

پاکستان مدرسہ ایجوکیشن بورڈ کی تشکیل:

علوم دینیہ کے ساتھ ساتھ عصری علوم کی تدریس کی اہمیت کا ادراک کرتے ہوئے قیام پاکستان سے قبل جس طرح ندوۃ العلماء لکھنو، مدرسہ الاصلاح سرائے میر اور جامعہ عباسیہ بہاولپور جیسے ادارے تشکیل دیئے گئے جہاں سے دینی علوم کی اشاعت اور تحقیق وتصنیف کی روایت کے احیاء اور سرپرستی کے لیے ندوۃ العلماء سمیت مذکورہ دیگر اداروں نے جو خدمات سرانجام دیں ان کو سبھی نے سراہا۔ مولانا سیّد سلیمان ندوی، مولانا مسعود عالم ندوی، مولانا عبدالسلام ندوی، مولانا ابوالحسن میاں ندوی جیسے قابل رشک محققین اور مصنفین دارالعلوم ندوۃ ہی کے فارغ التحصیل تھے۔ پاکستان مدرسہ ایجوکیشن بورڈ کا مقصد بھی ایسے ہی بلند پایہ علماء اور محققین تیار کرنا ہے۔

i۔ دینی مدارس اور اس کی تدریس پر "پرائیویٹ سیکٹر" کی مکمل گرفت ہے۔ اس وقت وطن عزیز میں حسب ذیل تنظیمات اپنے اپنے مسلک کے نمائندے کے طور پر دینی تدریسی وتعلیمی بورڈز کے طور پر خدمات سرانجام دے رہے ہیں۔

نمبر شمار	بورڈز	تعداد ملحقہ مدارس
1۔	تنظیم المدارس (بریلوی)	5000 تقریباً
2۔	وفاق المدارس (دیوبندی)	9000 تقریباً
3۔	رابطۃ المدارس (جماعت اسلامی)	500 تقریباً
4۔	وفاق المدارس سلفیہ (اہل حدیث)	500 تقریباً
5۔	وفاق المدارس شیعہ (اہل تشیع)	450 تقریباً

ان تعلیمی بورڈز کے ساتھ تقریباً 15,450 مدارس کا الحاق (Affiliation) ہے۔ان مدارس میں درس نظامی کا آٹھ سالہ کورس رائج ہے۔ یہاں سے فارغ التحصیل طالب علم کو "شہادۃ العالمیہ فی العلوم العربیہ والاسلامیہ" کی سند جاری کی جاتی ہے۔جس کو ہائر ایجوکیشن کمیشن نے ایم اے اسلامیات وعربی کے برابر تسلیم کر رکھا ہے۔

1۔ "ماڈل دینی مدرسہ"

گورنمنٹ سیکٹر میں وفاق وزارت مذہبی امور نے سال 2001ء میں "ماڈل دینی مدرسہ" کی تشکیل کا منصوبہ بنایا جس کے لیے "پاکستان مدرسہ آرڈیننس 2001"اور "پاکستان مدرسہ ایجوکیشن بورڈ" سمیت دیگر اموراور شعبہ جات معرض وجود میں آئے۔اسی تسلسل میں وزارت مذہبی امور،حکومت پاکستان،اسلام آباد میں "شعبہ دینی مدارس" بھی قائم کیا گیا جس نے ماڈل دینی مدارس کے لیے ایک مکمل نصاب وضع کیا۔ یہ نصاب تعلیم 11 سال پر مشتمل ہے جس کے مدارج حسب ذیل ہیں۔

i۔	درجہ ثانویہ (سیکنڈری سطح)	دورانیہ پانچ سال
ii۔	درجہ اجارہ عالیہ (گریجویٹ سطح)	دورانیہ چار سال
iii۔	شعبہ ہائے تخصص (پوسٹ گریجویٹ سطح)	دورانیہ دوسال

"ماڈل دینی مدرسہ" کا نصاب روایتی دینی درسیات اور عصری تعلیم اور مضامین کے امتزاج پر مبنی ہے۔ یہ نصاب تعلیم وفاقی وزارت مذہبی امور اسلام آباد کے زیر انتظام ماڈل مدارس میں رائج ہے۔وفاقی حکومت نے اب تک صرف تین ماڈل مدارس قائم کئے ہیں۔جس میں ایک اسلام آباد میں "ماڈل مدرسہ برائے طالبات" جبکہ بقیہ دو کراچی اور سکھر (برائے طلبہ) ہیں۔

بعض حلقوں کی طرف سے اس منصوبہ کو دینی مدارس کی آزادی اور خود مختاری کے خلاف سازش قرار دیا

گیا ہے۔اس قسم کے شبہات یقیناً غلط فہمی ہی کا نتیجہ ہوسکتے ہیں ورنہ دینی مدارس بورڈ کے قیام کے آرڈیننس میں کہیں اشارۃً یا کنایۃً بھی کوئی ایسی بات نہیں کہی گئی۔اس آرڈیننس کا مقصد نہ تو دینی مدارس کی خودمختاری اور آزادی کو ختم کرنا ہے، نہ ہی کسی مدرسہ یا دارالعلوم پر مجوزہ نصاب مسلط کرنا ہے اور نہ ہی کسی ادارہ کو مدرسہ بورڈ کے ساتھ الحاق کرنے پر مجبور کیا جاسکتا ہے۔ جہاں نجی اداروں کو اشاعت علم کا مقدس فریضہ انجام دینے کے لیے تعلیمی ادارے قائم کرنے کا حق حاصل ہے وہاں حکومت کا بھی یہ فرض عین ہے۔اسلامی حکومتوں کی روایت رہی ہے کہ انہوں نے دینی و دنیوی علوم کی نہایت فراخ دلانہ سرپرستی کی، اس مقصد کے لیے اعلیٰ درجہ کے مدارس بھی قائم کئے اور طلبہ و محققین کے لیے کتب خانے بھی۔ پاکستان مدرسہ ایجوکیشن بورڈ آرڈیننس کے پورے متن میں کہیں دور دور تک کوئی ایسا اشارہ نہیں ملتا کہ موجودہ دینی مدارس کی آزادی، نظم و نسق، نظام و نصاب، کارکردگی اور فعالیت میں کسی طرح کی مداخلت مقصود ہے۔

دینی مدارس کے نصاب پر نظر ثانی اور "مدرسہ تعلیمی بورڈ" کی ضرورت کا ادراک روزنامہ نوائے وقت لاہور، ۱۹ اگست ۲۰۰۱ء کے اداریہ میں بھی کیا گیا ہے۔اداریہ کے الفاظ یہ ہیں:

"یہ احساس تو ہمیشہ رہا ہے کہ دینی اور دنیوی تعلیم کا دوہرا نظام ختم ہونا چاہئے اور دینی مدارس میں بھی عصری علوم اسی طرح پڑھائے جائیں جس طرح عصری علوم کے اداروں میں دینیات اور اسلامی تعلیم لازمی ہے۔اس مقصد کے لیے کی جانے والی کوششوں کو ہمیشہ سراہا گیا ہے اور بعض روشن خیال علماء کرام نے اپنے طور پر ایسے دینی ادارے قائم بھی کئے ہیں جہاں درس نظامی کے ساتھ عصری علوم کی تدریس بھی ہو رہی ہے"۔

حقیقت یہ ہے کہ ہمارے معاشرے کو ایسے رجال کار کی اشد ضرورت ہے جو عصرِ حاضر کے تقاضوں اور اکیسویں صدی کے چیلنجوں کے پیش نظر اسلام کی تبلیغ و تشریح کی صلاحیت رکھتے ہوئے نیز عصر حاضر کے تقاضوں کے پیش نظر احکام اسلام کی ترویج و تنفیذ میں ممد و معاون ثابت ہوں۔انہیں قرآن و حدیث اور علم فقہ پر بھی عبور حاصل ہو اور اسلامی تاریخ، سیاسیات، معاشیات اور قانون پر بھی۔(۲۷)

حوالہ جات و حواشی

۱۔ اُردو دائرہ معارف اسلامیہ، پنجاب یونیورسٹی ۱۹۸۹ء، ۲۲/۳۶۴۔

۲۔ شلبی، ڈاکٹر احمد، تاریخ تعلیم و تربیت، ادارہ ثقافت اسلامیہ، لاہور ۱۹۹۹ء، ص ۱۹۷، ۱۹۶

۳۔ خلیق احمد نظامی، حیات شیخ عبدالحق محدث دہلوی، لاہور، مکتبہ رحمانیہ، ص ۹۔۱۰۔

۴۔ رحمان علی، مولوی، تذکرہ علمائے ہند، لکھنؤ نولکشور، ۱۹۱۴ء، ص ۲۳۔

۵۔ محمد حفیظ الرحمٰن، تاریخ اوچ، ہلی ۱۹۳۱ء، ص ۱۰۴۔

۶۔ عبدالحی حسنی، ہندوپاکستان کا قدیم درس نظامی، ماہنامہ ثقافت، ادارہ ثقافت اسلامیہ اگست ۱۹۶۷ء،ص۱۶۲۔
۷۔ شیخ محمد اکرام، رودکوثر، لاہور، ادارہ ثقافت اسلامیہ، ۱۹۷۵ء ص۱۶۲۔
۸۔ عبدالحی حسنی، ہندوپاکستان کا قدیم درس نظامی، ماہنامہ ثقافت، ادارہ ثقافت اسلامیہ اگست ۱۹۶۷ء،ص۳۱،۳۲۔
۹۔ عبدالحی حسنی، ہندوپاکستان کا قدیم درس نظامی، ماہنامہ ثقافت، ادارہ ثقافت اسلامیہ اگست ۱۹۶۷ء،ص۳۲۔
۱۰۔ ابوالحسنات ندوی، ہندوستان کی قدیم اسلامی درس گاہیں، لاہور، مکتبہ خاور، ۱۹۷۹ء، ص۲۷۔
۱۱۔ اُردو دائرہ معارف اسلامیہ، پنجاب یونیورسٹی ۱۹۸۹، ج ۲۲،ص ۳۵۵۔
۲۱۔ شیخ محمد اکرام، رودِکوثر، ادارۃ ثقافت اسلامیہ، لاہور ۱۹۸۹ء، ص ۶۰۴۔
۱۳۔ معقولات (Rational Sciences) معقول کی جمع، علوم حکمت، علوم فلسفہ وعلوم منطق وغیرہ
۱۴۔ منقول کی جمع۔ وہ کتابیں جن میں منقول سے بحث ہو۔
۱۵۔ اُردو دائرہ معارف اسلامیہ، پنجاب یونیورسٹی ۱۹۸۹ء، ج ۲۲،ص ۳۶۵۔
۱۶۔ ڈاکٹر انجم رحمانی، پاکستان میں تعلیم۔ایک تحقیقی جائزہ، ص ۶۴
۱۷۔ دائرہ معارف اسلامیہ، جامعہ پنجاب، ص: ۳۵۵
۱۸۔ ڈاکٹر محمود احمد غازی، ماڈل دینی مدارس (ضرورت، آرڈیننس، نصاب) وفاقی وزارت مذہبی امور اسلام آباد
۱۹۔ ڈاکٹر انجم رحمانی، پاکستان میں تعلیم، رائٹر کوآپریٹو سوسائٹی لاہور، ۲۰۰۶، ص ۶۶، ۶۷۔
۲۰۔ ابوالحسنات ندوی، ہندوستان کی قدیم اسلامی درس گاہیں، لاہور، مکتبہ خاور، ۱۹۷۹، ص ۹۵۔
۲۱۔ سیّد مناظر احسن گیلانی، پاک وہند میں مسلمانوں کا نظام تعلیم وتربیت، مکتبہ رحمانیہ، لاہور ص ۵، ۶۔
۲۲۔ رپورٹ "قومی کمیٹی برائے دینی مدارس" وفاقی وزارت مذہبی امور اسلام آباد، ۱۹۷۹، ص ۶۵۔
۲۳۔ رپورٹ قومی کمیٹی برائے دینی مدارس ۱۹۷۹، ص: ۱۶۸
۲۴۔ تعلیم اسلامی تناظر میں، انسٹیٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز، اسلام آباد، ص ۲۰۵
۲۵۔ تعلیم اسلامی تناظر میں، انسٹیٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز، اسلام آباد، ص ۱۱۸۔
۲۶۔ تعلیم اسلامی تناظر میں، انسٹیٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز، اسلام آباد، ص ۱۹۹-۲۰۰۔
۲۷۔ ڈاکٹر محمود احمد غازی، ماڈل دینی مدارس (ضرورت، آرڈیننس، نصاب) وفاقی وزارت مذہبی امور اسلام آباد

جاہلیت اور صدر اسلام میں مراثی ادب کا تقابلی مطالعہ

*ڈاکٹر سید ازکیا ہاشمی

**ڈاکٹر محی الدین ہاشمی

***ڈاکٹر محمد عبداللہ

"Marthiyah" (elegy) in Arabic is used for a mournful poem, a funeral song or a lament for the deceased person. The elegiac style of poetry does exist in each language of the word which reflects variety of expression styles of natural sentiments and the poet's affiliation with deceased person. Like any other language, the Arabs have also contributed towards this branch of literature and produced a remarkable elegiac poetry with its own prominent features. After the advent of Islam, the tradition of elegiac Arabic poetry was continued but reformed under the influence of Islamic teachings. It was, then, associated with overall Islamic ethics of grief as derived for the Holy Qur'an and Sunnah of the Prophet (SAW) which discourages extreme attitude expression of grief, hopelessness and impatience. This paper presents a comparative study of both pre and post Islamic elegiac literature with special focus on highlighting the Islamic reforms or modifications in the ethics of grief as reflected in the Arabic elegiac poetry.

دنیا کی شاید ہی کوئی زبان ہو جس میں شعراء نے مرنے والوں سے متعلق اپنے جذبات کا اظہار نہ کیا ہو۔ محبت نے اگر غزلیہ شاعری کو جنم دیا ہے تو مرثیہ نے بھی اسی کی آغوش میں پرورش پائی ہے۔ دنیا کی تقریباً ہر زبان میں رثائی ادب کا ذخیرہ موجود ہے جس سے شعراء کے ذوق تخیل، اظہار بیان اور فطری جذبات کی عکاسی ہوتی ہے اور فوت شدگان کے محاسن وکمالات کا پتہ چلتا ہے۔ یورپ میں THRE NODY ELEGY اور DRGE وغیرہ سب رثائی اسالیب ہیں۔ اقوام عالم کی طرح عربوں نے بھی اپنے قدیم لٹریچر میں ''رثاء'' (مرثیہ گوئی) کو خاص اہمیت دی ہے اور دیگر اصناف سخن کی طرح اس صنف میں بھی یادگار ذخیرہ چھوڑا ہے جو اپنی امتیازی خصوصیات کی بناء پر عالمی ادب میں نمایاں مقام رکھتا ہے۔

* اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اسلامیات، گورنمنٹ پوسٹ گریجویٹ کالج، مانسہرہ

** اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ فکر اسلامی، تاریخ وثقافت، علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد

***ایسوسی ایٹ پروفیسر، شعبہ اسلامیات، گومل یونیورسٹی، ڈی آئی خان